باب4

مادرِ علمی، علی گڑھ کا زمانہ

علی گڑھ میں تعلیم

میں نے سال 1968 میں (*Three Years Degree Course Part-III*, TDC-III)
جس کو عرف عام میں بی اے کہتے ہیں، پاس کیا۔ محض پانچ نمبروں کے فرق سے فرسٹ ڈویژن رہ گئی۔
میرے نانا جان کی مالی حالت مجھے آگے پڑھانے کے قابل نہیں تھی لیکن میرا شوق مزید تعلیم حاصل کرنا
تھا۔ انہوں نے میرے شوق کو دیکھ کر کہا کہ تمہیں ابتدائی خرچ تو دے سکتا ہوں لیکن مسلسل دو سال تک
خرچ برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس کو ہی غنیمت جانا اور داخلے کی تیاری کی۔ میری خواہش تھی
کہ میں اکنامکس میں ایم اے کروں جبکہ میرے شفیق استاد پروفیسر سیف الدین سوز کا مشورہ تھا کہ میں
جرنلزم میں ایم اے کروں۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں میرے داخلے کا بندوبست بھی کرلیا۔
عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد، نام اور تاریخ کے حوالہ سے تو خوش آئند بات تھی لیکن اس وقت کشمیر کے
معاشرہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ہر دل میں چھاپ تھی۔ کشمیری اعلیٰ تعلیم کے لیے اسی یونیورسٹی کا رخ
کرتے تھے جس کو چھوٹا پاکستان سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جرنلزم نامانوس مضمون لگتا تھا۔
میں اپنے ایک عزیز رشتہ دار عبدالواحد قریشی صاحب جوان ہی دنوں علی گڑھ سے اکنامکس

میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے کشمیر یونیورسٹی میں بطور لیکچرر تعینات[58] ہوئے تھے اور بعد میں کشمیر
اور سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے وائس چانسلر ریٹائرڈ ہوئے، سے مشورہ لینے گیا انہوں نے بہت خوشی کا اظہا
رکیا اور اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنے اساتذہ کرام کا پتا اور ہندوستان کے بلکہ عالم اسلام کے ایک
مشہور ماہر معاشیات ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نام خط بھی دیا جو اس زمانے میں وہاں پروفیسر تھے اور
آج کل غالباً اسلامی ترقیاتی بینک جدہ میں اعلیٰ عہدے دار ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں پر داخلہ دلا دیا۔
میں نے ایک دو کلاسز بھی لیں۔ فیکلٹی کے سربراہ ایک روز ہماری کلاس لے رہے تھے۔ اس دوران
انہوں نے کلاس کے تمام لڑکوں سے غیر رسمی ملاقات اور گپ شپ بھی کی۔ میرے ساتھ گپ شپ کے
دوران انہوں نے کہا کہ آپ کو لاء فیکلٹی میں داخلہ لینا چاہیے تھا، وہاں آپ کا مستقبل روشن ہوگا۔ اس
کے لیے انہوں نے مجھے بہت زیادہ آمادہ کیا اور فیکلٹی کے سربراہ جو اتفاقاً ان کے بھائی (MRA) ایم آر
اے خان (محمد رحمن علی خان) تھے، سے میرے داخلے کی بات کی اور میرا داخلہ وہاں کرا دیا۔ حالاں کہ
قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا نہ تو میرا کوئی ارادہ تھا اور نہ ہی میں نے کبھی ایسا سوچا ہی تھا۔ یہی کچھ
میرے ساتھ کالج میں داخلہ لینے کے وقت بھی ہوا کہ سائنس میں داخلے کے باوجود پرنسپل نے میرا
ڈسپلن تبدیل کروا کر مجھے آرٹس میں داخلہ دلایا۔ اللہ تعالیٰ جس شخص سے جو کام لینا چاہتا ہے، اس کی
پرورش بھی اسی طریقہ سے کرواتا ہے۔

؎ وقت کرتا ہے پرورش برسوں!

وہاں دوسرا مسئلہ رہائش کا تھا۔ علی گڑھ میں ہاسٹل کے بغیر رہنا ممکن نہیں تھا اور اگر گھر سے
باہر بلکہ علاقے سے دور رہ کر پڑھنا ہو تو ہاسٹل سے بہتر رہائش اور تربیت گاہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ جہاں
طرح طرح کی تہذیب اور پس منظر کے لڑکوں سے واسطہ پڑتا ہے اور انسان نصابی علم کے علاوہ
معاشرتی علم اور بود و باش سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ کسی مفکر نے تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
دوسروں کے حقوق کے احترام میں اپنے اوپر پابندی لگانے والا شخص مہذب ہوتا ہے۔ اور اس تہذیب
کا ٹیسٹ ملٹی کلچر سوسائٹی میں ہی ہوسکتا ہے اور یہ یہیں پروان چڑھتی ہے۔ میں اور دلاور میر کے علاوہ

چنداور دوست علی گڑھ شہر کے اندر کچھ روز ایک مسافر خانہ میں ٹھہرے جو غالباً نواب وقار الملک نے دور دراز سے آنے والے مسلمان لڑکوں کے لیے بنایا تھا۔

میں وہاں ناقص خوراک کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ تین روز تک شدید خونی پیچش لگے رہے۔ کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا' بال آخر میں یونیورسٹی کے حکیم اجمل خان طبیہ کالج کے ایک مشہور حکیم افہام اللہ خان کے پاس گیا۔ انہوں نے تین پڑیاں اور آب جو کی ایک بوتل دی۔ اس کی میں نے تین خوراکیں لینی تھیں۔ دوسری خوراک کے بعد میں نے 70 فیصدی افاقہ محسوس کیا اور تقریباً 14 گھنٹے مسلسل سویا رہا۔ جب جاگا تو ساتھیوں نے کہا کہ انہوں نے یونیورسٹی کے قریب شمشاد مارکیٹ کے پاس ایک گھر میں رہنے کا بندوبست کیا ہے جو کسی نواب کا گھر تھا جس کا بیٹا شمشاد مارکیٹ میں کتابوں کی دکان کرتا تھا۔ ہم لوگ کچھ عرصہ وہاں رہے اور اس کے بعد یونیورسٹی کے ہاسٹل سرسید ہال میں ہمیں رہائش مل گئی لیکن ہم الگ الگ کمروں میں رکھے گئے۔ مجھے سرسید ہال کے ساؤتھ ہاسٹل کے کمرا نمبر 29 میں جگہ ملی جہاں فرنٹ روم میں چار اور بیک روم میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ بیک روم میں عموماً یونیورسٹی کا سینئر یا سینئر کلاس میں پڑھنے والا طالب علم رہا کرتا تھا۔ بیک روم میں رہنا بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی اور وہاں رہنے والے کو Back Rome Partner کہتے تھے۔

تعارفی تقریب

یونیورسٹی کی روایات کے مطابق ہاسٹل میں نئے آنے والے ہر لیول کے طالب علم کو ایک تعارفی رات سے گزرنا ہوتا تھا جس کو وہاں Introduction Night کہتے ہیں۔ اس رات ہاسٹل کے سینئر لوگ نئے لوگوں کو دعوت کھلا کر ان سے اپنا اپنا تعارف کرواتے تھے۔ ہر طالب علم کے ساتھ مختلف نوعیت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مجھے ان لوگوں نے مرغ اور بلی کی آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے کو کہا، میرے روم پارٹنر ظہیر نامی ایک رام پوری پٹھان تھے۔ پٹھان دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہوتے ہیں، اس لیے ان کی وساطت سے میں صرف مرغ کی اداکاری کے بعد ہی چھوٹ گیا اور اگلے سال اس

کمرے میں آنے والے نئے طالب علم کو میں نے بلی کا کردار ادا کروا کر چھڑوا دیا۔

اندر سنگھ

یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں گھر واپس آیا تو میرے نانا صاحب نے مجھے کہا کہ وہ میرا خرچ برداشت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اس لیے میں کوئی نوکری کر لوں۔ چنانچہ انہوں نے غلام محمد صادق (مرحوم) جو اس زمانہ میں کشمیر کے وزیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے، کو کہہ کر مجھے کیرن ہائی سکول میں مدرس مقرر کروا دیا۔ میرا دل تو نہیں مانتا تھا اور اس بات کا مجھے بہت صدمہ بھی ہوا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی شام سردار اندر سنگھ ملاجن کا ذکر قبل ازیں موئے مقدس کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔ انہوں نے مخصوص مقامی زبان میں مجھے کہا کہ ''سوراں والی شکل کیاں بڑائی ائی''۔ میں نے ان کو ٹال دیا لیکن وہ میرے ساتھ میرے گھر آ گیا اور مجھے ماجرا بتانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ میں نے اس کو ساری بات بتائی جس پر اسے بہت دکھ ہوا اور وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے میرے نانا جان کو کمرے میں بلا کر کہا کہ کچھ آپ کریں، کچھ میں کروں گا، اس کو تعلیم مکمل کرنے دیں۔ نانا جان نے اپنی مجبوری، جو جائز تھی، بیان کرتے ہوئے اس سے تو اتفاق کیا لیکن اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی پوزیشن صاف صاف بتا دی۔ اللہ تعالیٰ اس سکھ کا بھلا کرے، اس نے کہا کہ میں پانچ ہزار روپے دوں گا، باقی آپ دیں چنانچہ آٹھ ہزار روپے سے میرا کام عزت و آبرو سے چل گیا اور میں اللہ پاک کی مہربانی اور اس سکھ کی بروقت مدد کی وجہ سے وکیل' جج اور چیف جسٹس بھی بن گیا۔ (الحمد اللہ)۔ اللہ تعالیٰ اس کی نسلوں کا بھی بھلا کرے۔

جنون بڑھ گیا لے کے آگے مجھے
خضر سوچتا، ہاتھ ملتا رہا

ہم لوگ ایک دوسرے کو مذہب کی بنیاد پر مرنے مارنے پر تلے ہوئے سمجھتے ہیں حالاں کہ

برائی انسان میں ہوتی ہے، ہندو یا مسلمان میں نہیں۔جس کی تربیت اور خصلت بری ہو، وہ برا ہے بھلے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم،خواہ وہ نوحؑ کا بیٹا ہو یا راون کا۔ میں جب بھی کشمیر گیا، اندر سنگھ کے ہاں ضرور جاتا ہوں۔2014 میں ان کی بیٹی کو اس کے خاوند نے مبینہ طور قتل کر دیا جس کے افسوس کے لیے میں اس کے گھر گیا۔ وہ تو نہیں مل سکا، البتہ ان کی بیوی سلھکنی کور سے تعزیت کی۔ اللہ کسی کو بچیوں کے حوالے سے آزمائش میں نہ ڈالے۔

پروفیسر محمد غوث

تعلیم جاری رکھنے یا نہ رکھنے کی کشمکش میں میرے دو مہینے ضائع ہو گئے جبکہ یونیورسٹی میں اسی سال سے سمسٹر سسٹم کا آغاز کیا گیا تھا۔ جب میں واپس فیکلٹی پہنچا تو اگلے روز میرا انٹرنیشنل لاء ٹیوٹوریل گروپ کا اجلاس تھا۔ اس گروپ میں قانون کی کوئی پروپوزیشن یا کسی ہائی کورٹ کے رپورٹڈ کیس کی رپورٹ دے دیتے تھے اور زیر تنازع نکتہ پر اپنے دلائل دینے ہوتے تھے۔ جس روز میں گروپ میں گیا، اس روز نیورم برگ ٹرائل سے متعلق کیس زیر بحث تھا۔ میرا کلاس میں رول نمبر دس تھا اور اتفاقاً یونیورسٹی امتحان میں بھی میرا یہی رول نمبر تھا۔ پروفیسر محمد غوث نامی ایک استاد یہ مضمون پڑھاتے تھے۔ جب انہوں نے رول نمبر دس پکارا تو میں نے yes sir کہا۔ انہوں نے کہا کہ Gentleman you are from? میں نے جواباً کشمیر کہا، جس پر انہوں نے کہا:

Sorry Gentleman we are meeting for the last time and you are coming for the first time, you better leave the class room and graze in the medows of Kashmir.

اس کے بعد انہوں نے نہ تو مجھے بیٹھنے کو کہا اور نہ ہی کلاس سے نکل جانے کو، چنانچہ میں بیٹھ گیا اور ان لوگوں کے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف دلائل سنتا رہا۔

اگلے ماہ پہلے سمسٹر کا امتحان ہونا تھا میں کیا کر سکتا تھا لیکن اللہ کا نام لے کر میں نے کلاس کے

انیس نامی ایک سینئر طالب علم سے جو کہ لکھنو کا رہنے والا تھا' نوٹس لیے جن کو تین یا چار دن پڑھتا رہا، پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے سمجھا بھی دے اور جس جس مضمون کے tutorial group ہوئے ہیں ان کی کارکردگی بھی سمجھا دے۔ اللہ پاک اس کا بھلا کرے، اس نے مجھے پہلے سمسٹر کے چھے مضامین اپنے نوٹس کے مطابق سمجھا دیئے جن کی تفصیل میں نے اپنے سوال جواب سیریز سے پڑھ لی جبکہ tutorial group کی صرف assessment ہونی تھی۔ اس کے نمبرز متعلقہ استاد اپنی صوابدید کے مطابق لگاتا تھا غالباً جس کے بیس نمبر ہوا کرتے تھے۔ رزلٹ سے کچھ پہلے پروفیسر محمد غوث نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہی کہا Who is roll No. 10?? میں نے کہا، یس سر۔ انہوں نے جواب دیا۔ No I can't believe ۔ میں خود بھی حیران ہو گیا کہ کیا ماجرا ہے۔ اس وقت تک رزلٹ کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ اسی روز شام کو ہو گیا۔ کلاس کے بعد پروفیسر صاحب مجھے فیکلٹی سے ملحق کینٹین پر لے گئے اور چائے منگوائی۔ سارے لوگ حیران ہو گئے کہ پروفیسر محمد غوث اور بے تکلف! لیکن وہ بے تکلف نہیں ہوئے تھے بلکہ اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے۔ جب ان کی تحقیقات مکمل ہو گئیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ سر معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پیپر میں تمہارے سب سے زیادہ نمبرز ہیں اور Distinction ہے میں حیران ہوں کہ ٹیوٹوریل کا کوئی نمبر نہ ہونے کے باوجود تم نے اتنے نمبرز کس طرح لے لیے۔ مجھے بھی اس پر تعجب ہوا اور حیرانی اس وقت حد سے بڑھ گئی جب یہ پتا چلا کہ Family Laws، جن میں ہندو اور محمڈن لاء شامل ہیں، میں بھی میری Distinction ہے اور مجموعی طور پر کلاس میں سیکنڈ پوزیشن ہے۔ الحمد اللہ اس کے بعد میں نے یہ پوزیشن بحال رکھنے کی کوشش کی اور رہی بھی۔

پہلی پوزیشن ایک ہندو طالب علم پردیپ کمار اگروال لے گیا جو اتر پردیش ہائی کورٹ کے جج کے طور ریٹائر ہوا گو کہ Technically پہلی پوزیشن میری ہونی تھی وہ یوں کہ اس سال ہندوستان بار کونسل ایکٹ نافذ ہوا تھا جس کے تحت لاء کمیشن کی سفارشات کے مطابق قانون کی ڈگری تین سالہ لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ اس لیے پورے ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے اس سال سے ایل ایل بی کا

تین سالہ کورس شروع کر دیا تھا۔ جموں وکشمیر میں بار کونسل ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اس کے لیے وہاں کی اسمبلی کو خود قانون سازی کرنا تھی۔ پارلیمنٹ ہند کا قانون اس موضوع پر وہاں خود بخود نافذ نہیں ہوتا تھا۔ گو کہ ہندوستانی آئین کے تحت ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کا صوبہ ہے لیکن اندرونی خودمختاری کی وجہ سے ہندوستان کے آئین کا ریاستوں سے متعلق چیپٹر ریاست کشمیر میں نافذ نہیں ہے۔ ریاست کشمیر کے لڑکوں نے فیکلٹی کے ڈین اور وائس چانسلر سے مطالبہ کیا کہ چوں کہ ہماری ریاست میں تین سالہ کورس کی قید نہیں ہے، اس لیے ہمارے لیے دوسالہ کورس جاری رکھا جائے۔ بڑی لے دے کر کے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ جو لوگ نوکری کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے دوسالہ کورس ہوگا اور جنہوں نے وکالت کا لائسنس لینا ہے ان کے لیے تین سالہ کورس ہوگا۔ دوسالہ کورس ہونے کی صورت میں میری پوزیشن پہلی بنتی تھی کیوں کہ پردیپ کمار نے تین سالہ کورس کے لیے Opt کیا تھا اور اس کو تیسرے سال کے بعد ڈگری ملنی تھی لیکن اس نے یونیورسٹی کے رجسٹرار اور فیکلٹی کے ایک ہندو پروفیسر رتن لال ریکھی سے مل کر اپنی ڈگری دوسالہ کورس کی کروائی اس طرح میں پہلی پوزیشن اور گولڈ میڈل سے محروم ہو گیا جبکہ اس کو تیسرے سال کے بعد بھی گولڈ میڈل مل سکتا تھا لیکن حسد، بغض اور بخیلی کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔ اللہ تعالی اس بیماری سے ہر ایک کو نجات دے۔ آمین۔

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگ و راہ
ہم وہ نہیں جن کو زمانہ بنا گیا

پروفیسر ریکھی اور پروفیسر عابدی

یونیورسٹی کے دوسرے سال مجھے فیکلٹی کی لائبریری سوسائٹی کا ہیڈ بنایا گیا۔ اس عرصہ کے دوران لائبریری سے کرمنل لاء پر ایک مستند کتاب Shamsul Huda on Criminal Law کسی طرح ضائع ہو گئی۔ معاملہ ڈسپلن کمیٹی کے سپرد ہوا جس کے سربراہ پروفیسر ریکھی تھے انہوں نے مجھ سے ایک مجرم کی طرح برتاؤ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کتاب میں نے لی تھی جو یا تو فروخت کر دی

ہے یا چھپا دی ہے۔ یہ ایک ناپید کتاب تھی اور شاید ہی ہندوستان کی کسی اور لائبریری میں ہو اس لیے اس کی خاطر زیادہ ہی حساس چھان بین کی گئی۔ یہ کتاب فیکلٹی میں نایاب کے خانے میں رکھی ہوئی تھی اور صرف ریفرنس بک تھی۔ اس سال ہمارا کرمنل لاء کا مضمون بھی نہیں تھا جو کہ ہم لوگوں نے پہلے دو سمسٹروں میں پڑھ لیا تھا۔ یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ پروفیسر صاحب نے مجھے یونیورسٹی سے نکالنے کی سفارش کرنا تھی کہ پروفیسر عابدی جو کہ انگریزی کے پروفیسر تھے اور یونیورسٹی کے پرووسٹ بھی تھے، نے مداخلت کی جس پر معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن کتاب میرے کھاتے میں ڈال دی گئی۔ اللہ پاک کا کرنا تھا کہ ایک روز انیس احمد نے جو کہ یونیورسٹی کے لاء فیکلٹی سے ایل ایل ایم کر کے فارغ ہو گئے تھے اور Jevuinil Justice System پر تھیسز لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب فیکلٹی کے ڈین، ایم آر اے خان (محمد رحمان علی خان) کو بھیج دی جو بعد ازاں پروفیسر ریکھی کے حوالے کی گئی۔ اس پر، پروفیسر ریکھی نے مجھ سے معذرت بھی کی اور پروفیسر عابدی کا شکریہ بھی ادا کیا جنہوں نے مجھے یونیورسٹی سے نکالے جانے سے بچا لیا تھا۔ پروفیسر عابدی کو غالباً اس کے بعد امریکہ یا برطانیہ میں ہندوستان کے سفیر کے طور بھی بھیجا گیا تھا۔ یہ تھی ان لوگوں کی لائبریری اور اس کی کتابوں کی حفاظت کی انتہا۔

پھر یوں کہ میں کتاب سے آگے نکل گیا

مولانا آزاد لائبریری

لاء فیکلٹی کی لائبریری کے علاوہ علی گڑھ میں ایک مرکزی لائبریری مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کے نام سے مشہور ہے جس میں قانون کی کتابوں کا ایک الگ شعبہ تھا اور اس میں بھی دنیا بھر کے رسالے اور کتابیں میسر ہیں۔ پروفیسر محمد غوث پوری یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے انتہائی کم آمیز اور کم گفتار استاد تھے جو سوائے سرسید مسجد کے جو کہ سرسید ہال کے اندر تھی یا مولانا آزاد لائبریری کے کہیں اور نظر نہیں آتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو مسجد سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا بیٹا بھی تھا، میں نے ان سے پوچھنے کی ہمت کی کیا آپ کا کوئی دوست بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ

اس بیٹے کے علاوہ مولانا آزاد لائبریری کی ساری پڑھے جانے والی کتابیں میری دوست ہیں اور چل دیئے۔ یہ تھا ان لوگوں کا علم دوستی اور کتاب دوستی کا عالم۔ بعدازاں مجھے بتایا گیا تھا کہ پروفیسر صاحب ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ میں بطور پروفیسر انٹرنیشنل لاء منتقل ہو گئے ہیں۔ علی گڑھ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں لوگ کتابیں پڑھنے کے عادی ہو جاتے تھے یا کروائے جاتے تھے۔ کلاس میں سمسٹر سسٹم کے اندر پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی موضوع پر پروفیسر آؤٹ لائن لیکچر دے کر ریفرنس بک لکھا دیتے تھے جس پر خود تیاری کر کے نوٹس پروفیسر صاحب کو دیئے جاتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں پڑھانے اور پڑھائی کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن اس کے لیے بنیاد کا پختہ ہونا ضروری ہے، اس وقت تو ہم لوگوں کو یہ بات بہت مشکل اور ناگوار لگتی تھی لیکن' مابعد اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔

میرے والد صاحب بھی ایک لائق استاد گزرے ہیں، وہ ہمارے بچوں کو کہا کرتے تھے کہ'' پڑھنا پڑھنے سے،لکھنا لکھنے سے' اور بولنا بولنے سے آتا ہے۔'' فی الواقع یہی درست ہے۔ میرے ہائی سکول کے زمانے کے پسندیدہ استاد عبدالغنی حسینی کہا کرتے تھے کہ انسان کا دماغ ایک کان کی مانند ہے آپ اس کو جتنا کھود کر گہرا جائیں گے اتنے ہی اچھے اور عمدہ جواہر ملیں گے۔ اس کے برعکس وہاں پر ایک پروفیسر جن کا نام غالباً غلام ذکریا تھا اور ہمیں لاء آف ٹارٹس پڑھاتے تھے' کہا کرتے تھے کہ قانون کی ڈگری سوال جواب کی کتاب سے پڑھ کر حاصل کریں' اور اس کی پریکٹس ریسرچ بکس پڑھ کر کریں۔ اگر دوران تعلیم ریسرچ بکس پڑھنا شروع کریں گے تو ڈگری زندگی بھر نہیں لے سکیں گے۔ وہ مثال دیا کرتے تھے کہ جو غوطہ زن سمندر کے کنارے بیٹھ کر موتی ڈھونڈتا ہے، اس کے ڈوبنے کے چانسز کم اور غوطہ لگانے والے کے زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے خطرہ مول نہ لیا کریں لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ کامیابی کے لیے شارٹ کٹ نہیں ہوا کرتے اس کے لیے شبانہ روز محنت کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی میں اکثر بڑے بڑے لوگ دورے پر آیا کرتے تھے اور اکثر لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔

؎ رہو جہاں میں کامراں
رہے دلوں میں یہ لگن

58

خان عبدالغفار خان علی گڑھ میں

ہمارے زمانے میں' غالباً 1969 کے آخر میں خان عبدالغفار خان مرحوم بھی علی گڑھ آئے تھے جن کی حکومتی سطح پر حفاظت کے بے پناہ انتظامات کیے گئے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے ایم ایم ہال (محسن الملک ہال) کے سبزہ زار میں تقریر کی۔ یونیورسٹی سے منسلک ایک منٹو سرکل ہائی سکول بھی ہے جو پہلی جماعت سے کلاسیں لیتا ہے اور اضافی درس گاہ ہے۔ مجھے صحیح یاد نہیں پڑتا کہ خان صاحب نے اپنے بارے میں یا کسی اور کے بارے میں کہا کہ'' ہم بھی پرانے علیگ ہیں اور منٹو سرکل میں پڑھتے تھے۔ ہم لوگ بہت شیطان ہوا کرتے تھے (میرے خیال میں انہوں نے یہ لفظ شرارت کے متبادل لفظ کے طور پر استعمال کیا تھا)۔ ہال کے ایک کونے سے ایک لڑکے نے آواز کس کے کہا،'' بابا آپ کو ابھی کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔'' خان صاحب نے برجستہ جواب دیا،'' بیٹا تم رام پور کے پٹھان لگتے ہو۔'' اس پر جلسہ گاہ زعفران زار بن گیا۔ وہ لڑکا ظہیر میرا بیک روم پارٹنر اور فی الواقع رام پور کا پٹھان تھا۔ گالی کے حوالہ سے ایک واقعہ سردار عبدالقیوم صاحب کا میری کتاب کی رونمائی کے حوالہ سے ہوا جب سردار صاحب نے کسی کو'' سوری دا'' کہہ کر کہا کہ معاف کرنا، دراصل گالی کے بغیر بات کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

رباط کانفرنس اور پاکستان

غالباً اسی سال پہلی عالمی اسلامی سربراہ کانفرنس رباط میں ہوئی تھی جس میں ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم ہندوستانی وفد کے سربراہ یا وفد کے ممبر کے طور شامل تھے۔ ہندوستانی وفد دو دن بعد ہی واپس آ گیا کیوں کہ پاکستان کے اعتراض پر ان لوگوں کو کانفرنس میں شامل نہیں ہونے دیا گیا۔ ان کی واپسی پر کشمیری لڑکوں جو کہ اس وقت علی گڑھ میں خاصی بڑی تعداد میں ہوا کرتے تھے نے' ان کے خلاف مظاہرہ کیا اور ناکام لوٹنے پر ہوٹنگ کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار کینیڈی ہال میں ایک تقریب میں اس کانفرنس کی روداد سناتے ہوئے کہا کہ'' پاکستانیوں کی مداخلت سے ہماری رہائش کی جگہ کی بجلی اور پانی بھی بند کیا گیا تھا۔'' نہ معلوم یہ بات سچ تھی یا نہیں لیکن ان کے کہنے

کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کا عالم اسلام میں بڑا مقام ہے اور اس کو ہندوستانی مسلمانوں کی اس کانفرنس میں شرکت پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا کیوں کہ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کو کافی تقویت ملتی، پاکستان ایک حقیقت ہے اور اس کو ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اس کے برعکس، ہندوستانی مسلمانوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کسی جلسے میں قرآن پاک کو دنیا کی بہترین لٹریچر کی کتاب کہا تھا، موصوف عربی زبان میں ایم اے اور قرآن پاک کے کسی موضوع پر ڈاکٹریٹ بھی تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے کون سی غلط بات کی تھی۔ قرآن سے بہتر لٹریچر تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا خدا تعالیٰ نے خود چیلنج کیا ہے کہ ''آپ اس جیسی کوئی آیت یا کلام لے آؤ جو آپ نہیں لا سکتے۔'' لیکن جدیدیت پسند مسلمان ہمیشہ سے معتوب ہی رہے ہیں اور یہ عالم اسلام کا المیہ ہے۔ یہی صورت اس وقت علامہ غامدی کی ہے جو عصرِ حاضر کی روشنی میں قرآن وحدیث کی تعبیر وتشریح کی وجہ سے زیر عتاب ملائیشیا میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلمانوں کو قدامت اور جدت کے درمیان توازن پیدا کرنا پڑے گا، وگرنہ خلیج بہت بڑھ جائے گی۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کہا کہ ان کے پاس 1948 کے اوائل میں ایک بار غلام السیدین یا کوئی دوسرے ماہر تعلیم (جن کا صحیح نام مجھے یاد نہیں آ رہا) آئے جن کو تعجب کے ساتھ دیکھ کر مولانا نے کہا کہ تم پاکستان نہیں گئے؟ جس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں اس پر مولانا نے ان کو سختی سے کہا کہ پاکستان ہماری مخالفت کے باوجود بن گیا ہے لیکن اب اس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور تم جیسے لوگوں کی وہاں بہت ضرورت ہے تم فوراً وہاں جاؤ۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ مسلم قیادت کو بھی پاکستان کے مضبوط اور بحال رہنے کا شدت سے احساس تھا اور اب بھی ہے کیوں کہ مسلمانوں کو ہندوستانی ہندو پاکستانی ہی کہتے ہیں۔

ہاسٹل کا ڈسپلن

علی گڑھ کا ماحول مکمل طور پر اسلامی طرز کا تھا۔ وہاں پر رہائش کے مختلف ہاسٹل تھے جن کو

''ہال'' کہتے ہیں اور مشاہیر کے ناموں سے منسوب ہیں۔ ان کے اندر مختلف ہوسٹلز تھے، ان کے بھی الگ الگ نام تھے۔ پرانے ہال میں سے سرسید ہال، محسن الملک ہال، وقار الملک ہال، آفتاب ہال مشہور ہیں۔ لڑکیوں کے ہال کا نام عبداللہ ہال تھا جو کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک نومسلم شیخ محمد عبداللہ نے تعمیر کروایا تھا۔ پہلے تو مجھے یہ گمان گزرا کہ یہ کشمیری رہنما مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے بنوایا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بیسویں دہائی میں پونچھ سے منتقل ہونے والے ایک نومسلم نے نوجوان لڑکیوں کے لیے یہ بلڈنگ بنوائی تھی جو اب بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ہال کے ساتھ ایک مسجد بھی ہوا کرتی تھی، البتہ مرکزی جامع مسجد سرسید ہال کے ساتھ ہی تھی جس کو سرسید مسجد کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مشاہیر کے مقبرے بھی ہیں۔ کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد مرحوم اور حکومت کویت نے سو، سو بیڈ کے الگ الگ ہاسٹل بھی یہاں بنوائے ہیں جو کشمیر ہاؤس اور کویت ہاؤس کے نام سے آج بھی موجود ہیں۔ ہر ہاسٹل میں ایک جنرل میس کے علاوہ ایک ویجیٹیرین میس بھی ہوا کرتا تھا۔ ہاسٹل خرچہ اس زمانے میں 20 سے 25 روپے ہوا کرتا تھا۔ کھانے میں عام طور پر گندم کی روٹی جس کو یونیورسٹی کی زبان میں ''ڈن لپ'' کہتے تھے، ملتی تھی اور ہر طالبعلم کو لازمی طور قومی لباس میں ڈائننگ ہال میں ہی کھانا کھانا ہوتا تھا۔ کسی طالب علم کے آنے میں تاخیر ہو جاتی تو اس کے لیے کھانا ڈائننگ ہال کی انگیٹھی میں رکھا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ میرے کھانے کی پلیٹ میں سے مکھی نکلی جس پر میں نے وہاں کے ویٹر ''نظیر میاں'' کو شکایت کی۔ اس نے برجستہ جواب دیا، ''کہ میاں 25 روپے میں سے مکھی ہی نکل سکتی ہے، ہاتھی تو نہیں نکل سکتا۔'' جس پر ایک قہقہہ لگا اور بات ختم ہو گئی۔ کمرے میں کھانا لانے کی اجازت نہیں تھی۔ ڈائننگ ہال اور یونیورسٹی گیٹ سے باہر کوئی بھی طالبعلم یونیورسٹی یونیفارم کے بغیر نہیں جا سکتا تھا جو سفید یا کالی شیروانی اور سفید پائجامہ تھی، خلاف ورزی پر جرمانے سے لے کر یونیورسٹی سے اخراج تک کی سزا مل سکتی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ سردیوں کے موسم میں پائے ملتے تھے جو عمومی طور ناشتہ یا لنچ ہوتا تھا اس میں چھوٹے بھینسے کے پائے ہوا کرتے تھے۔ ایک پورے کا پورا پایا ایک پلیٹ کے طور ملتا تھا اور بلا مبالغہ آدھ کلو کے قریب ہوتا تھا اس سے رتی بھر گوشت بھی الگ نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی سے

ملحق تصویر محل نامی سینما اور نقوی پارک کے نام سے مشہور ایک تفریحی پارک تھی جو طلبا اور طالبات کے لیے ہر قسم کی تفریح کے اسباب مہیا کرتے تھے۔ یہ دونوں مقام عشاق کی جنت تھے۔ اس کے علاوہ ''مداری گیٹ'' نامی بازار تفریح طبع کا مواقع فراہم کرتا تھا۔

ہم عصر طلبا اور ترانہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین ہندوستان کے طلبا کی یونیورسٹیوں میں مضبوط ترین تنظیموں میں سے ایک تھی۔ اس کے ہر سال انتخابات ہوا کرتے تھے۔ میرے زمانے کے کشمیری طلبا میں سے نمایاں دلاور میر، منظور بخشی، علی محمد، مظفر فاضلی، مجید مفتی، بلال نازکی، حکیم امتیاز، غلام نبی خان، عبدالغنی وکیل، مجید وٹالی، محمد زمان، ملک صادق، غلام محی الدین کھانڈے، خورشید احمد خان، عبدالرشید مرچال وغیرہ جو سب کے سب ہندوستان کی سیاست، اعلیٰ جوڈیشری اور بیوروکریسی کے کل پرزے ہیں، یونیورسٹی کی یونین پر قابض تھے۔ کھانڈے صاحب فاریسٹ لیسی ہیں۔ اس زمانے میں ہم سے جونیئر کلاس میں ہونے کے باوجود بڑی عیاشی کرایا کرتے تھے۔ میں چوں کہ فیکلٹی میں پوزیشن ہولڈر تھا، اس لیے میں سب کشمیری لڑکوں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا، جس وجہ سے یونیورسٹی میں میرا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ یونیورسٹی میں سیکنڈ پوزیشن اور دو پیپرز میں Distinction ہونے کی وجہ سے مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایل ایل ایم کرنے کے لیے پانچ صد روپے ماہوار وظیفے کی بھی پیشکش کی۔ لیکن میں نے وکالت کرنے کو ترجیح دی جس کے لیے ایل ایل بی ہی کافی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا اپنا ترانہ تھا جو کہ Ceremonial Occasions پر گایا جاتا تھا، یہ دراصل اسرار الحق مجاز لکھنوی کی ایک نظم ''نذر علی گڑھ'' ہے جو ان کی علی گڑھ سے والہانہ محبت کی عکاسی کرتی ہے۔ بعد ازاں اسی نظم کو ادارے کا ترانہ قرار دے دیا گیا۔ اس کی ولولہ انگیز انفرادیت کے باعث میں اس کو یہاں پورے کا پورا درج کرتا ہوں۔

58

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشار نگاہ نرگس ہوں پابستہ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
جو طاق حرم میں روشن ہے، وہ شمع یہا ں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
یہ دشت جنون دیوانوں کا، یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر مطرب رومانوں کا، یہ خلا بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو، افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے وفا کا ساز یہاں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں، اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے، اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
ہر شام ہے شام مصر یہاں، ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
جو ابر یہاں سے اٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر کوہ و دمن پر برسے گا ہر دشت و دمن پر برسے گا

خود اپنے چمن پر برسے گا،غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا،ہر سر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا
برسے گا، برسے گا، برسے گا

علی گڑھ، ایک چھوٹا سا پاکستان

کئی سال بعد جب میں پاکستان آیا اور کرنل محمد خان کی ایک کتاب پڑھی جس میں علی گڑھ کے بارے میں لکھا تھا کہ ''علی گڑھ ایک چھوٹا سا پاکستان اور پاکستان ایک بڑا سا علی گڑھ ہے۔'' میں جب بھی علی گڑھ کے اسلامی ماحول اور پاکستان کی تخلیق کے فلسفے کا باہم تقابل کرتا ہوں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر علی گڑھ کی تحریک نہ ہوتی تو مسلمانوں میں پاکستان کی تخلیق کے لیے جذبہ بیدار نہ ہوتا۔ کرنل محمد خان نے یقیناً سچ کہا ہے۔

سرینگر سے علی گڑھ جانے کے لیے ہمیں یا تو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی اور وہاں سے بذریعہ بس یا ٹرین علی گڑھ جانا ہوتا تھا یا پھر بذریعہ بس جموں اور وہاں سے پٹھان کوٹ جانا ہوتا تھا جہاں سے ٹرین کے ذریعہ دہلی جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پٹھان کوٹ تک ہی دو ریل گاڑیاں آتی تھیں۔ ایک کا نام سیالدہ اور دوسری کا کشمیرا ایکسپریس تھا۔ یہ ٹرین آٹھ سے دس گھنٹے میں ہمیں دلی پہنچا دیتی تھی جبکہ وہاں سے علی گڑھ بس کا سفر چار گھنٹے اور بذریعہ ٹرین کا دو گھنٹے کا تھا۔ علی گڑھ میں پڑھنا مسلمان لڑکوں کا Craze اور ایک Status Symbol سمجھا جاتا تھا، وگرنہ کشمیر یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی میں بھی بہترین اساتذہ اور شعبے موجود تھے۔ بہرحال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا ماحول کہیں میسر نہیں ہو سکتا۔ علی گڑھ سے دہلی اور آگرہ تقریباً برابر کی مسافت پر تھے، ہم لوگ مختصر تعطیلات کے دوران ان

میں سے کسی ایک جگہ چلے جایا کرتے تھے۔ آگرہ کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔[58]

دہلی میں جامع مسجد، قطب مینار، لال قلعہ؛ آگرہ میں تاج محل اور فتح پور سیکری میں قلعہ اور جامع مسجد کو دیکھ کر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا یقین ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے درسگاہیں، ریسرچ سینٹر، ہسپتال اور جدید علم پر بھی اسی طرح توجہ دی ہوتی تو برصغیر کے مسلمانوں کو یورپ پر سبقت حاصل ہوتی۔ جو قومیں محنت اور دیانت سے کام لیں اور کوئی جذبہ اور نصب العین سامنے رکھیں، وہ دنیا کے کسی بھی کونے سے اٹھ کر دوسرے کونے تک چھا جاتی ہیں اور اپنی عظمت کے نشان رہنمائی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر ان کے پسماندگان صالح اور محنتی ہوں تو یہ نشان رہنمائی اور اگر نالائق ہوں تو عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) نامی مفکر نے کہا ہے کہ قوموں کی تاریخ کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ کامیابی، پھر کامیابی کے نشہ میں غرور اور ناانصافی، اور پھر ان کے نتیجے میں زوال، اورنگزیب کے بعد یہی ہوا۔ بلکہ اورنگزیب نے ہی اس کی بنیاد ڈالی۔ یہی حال اب امریکہ کا ہونے والا ہے یونان، روم اور فارس کی تاریخ بھی اس کی گواہ ہے۔ فی الوقت یورپ بارڈر لائن پر ہے۔ بقول عابد سیال:

؎ دمکتے شہروں کا آئندہ دیکھنے عابد
خموش وخستہ مقامات کی طرف نکلیں

ٹی وی، پیرزادہ اور بھٹو

سال 1969 میں 26 جنوری یوم جمہوریہ ہند کی تقریبات دیکھنے کے لیے ہم لوگ دہلی گئے۔ لال قلعہ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے دہلی میں آباد ایک مہاجر تیرتھ رام آملہ جو ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے، کے گھر ٹی وی پر یہ پروگرام دیکھا۔ میں نے ٹی وی اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس سے اللہ کے سمیع البصیر ہونے کی صفت سمجھ میں آئی۔

آگرہ کے ایک دورے کے دوران میرے کلاس فیلو دلاور میر نے ایک خاتون سے ایک

بازار میں چھیڑ خانی کی جس پر اس نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا، میں معزز اور اعلیٰ خاندان سے ہوں، مجھے آوارہ نہ سمجھو۔ دلاور نے اس کو میری طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھی ''پیرزادہ'' ہے، میں نے تمہیں اس کے لیے پسند کیا ہے۔ اس پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

علی گڑھ میں آخری سال کے تحریری امتحان کے بعد زبانی امتحان لینے کے لیے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سہنا آئے جنہوں نے ہمارے گروپ میں سے غلام احمد بٹ نامی (غلام احمد بٹ دیہاتی کشمیریوں کا لیڈر تھا جس سے شہری کشمیری لڑتے تھے) سے پوچھا کہ ''ہمارے ہاں بھی بٹ ہیں 'یہ کیا ہوتا ہے؟'' اس لڑکے نے برجستہ جواب دیا، ''جناب بٹ، بھٹی اور بھٹو سب ایک ہوتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کو سینٹرل انڈیا میں بھٹی اور سندھ میں بھٹو کہتے ہیں۔ بھٹو صاحب (جو اس وقت پاکستانی وزیر خارجہ تھے) ہمارے خاندان کے ہیں۔'' گو کہ یہ بات حقیقت نہیں لیکن اس لڑکے نے جسٹس سہنا کو باور کرا لیا۔ جسٹس سہنا وہ جج ہیں جنہوں نے اندرا گاندھی کے الیکشن کو کالعدم قرار دیا تھا۔ اس پر ہندوستان میں ایمرجینسی نافذ کی گئی اور کانگریس کی چولیں ہل گئیں۔

غلام احمد بٹ انتہائی ظریف شخص تھا۔ یونیورسٹی ہاسٹل کے ایک عبادت گزار طالب علم نے اسے کہا کہ ''تو نماز نہیں پڑھتا۔'' اس نے جواب دیا جو لوگ زیادہ عبادت گزار ہوتے ہیں، ان سے آخرت میں غلطیوں کے بارے میں پوچھ گچھ بھی زیادہ ہوگی۔ جس کے پلے کچھ نہیں ہوگا، اس کی ایک ہی غلطی ہوگی اور خالی خالی کہتے ہوئے منزل پر پہنچ جائے گا۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے طلبا کی علی گڑھ میں اکثریت ہوا کرتی تھی۔ جن کی دو سرے لوگوں کے مقابلے میں یکجہتی لیکن آپس میں جموں اور کشمیری، شہری اور دیہاتی، کشمیری بولنے والے اور نہ بولنے والوں میں آپس کی تقسیم الگ تھی۔ دیہاتی لڑکے عمومی طور پر شہریوں پر حاوی ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے مالی طور پر متمول غلام محی الدین کھانڈے اور غلام محمد بٹ تھے۔ کھانڈے صاحب خوب خرچہ کیا کرتے تھے۔

58

نیرنگیاں

کوئی کتنا ہی اچھا طالب علم کیوں نہ رہا ہو، تعلیم سے فارغ ہو چکنے کے بعد جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو عموماً خوشگوار اور شرارتی لمحات اس کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جو کہ نادانستہ طور پر بھی رونما ہو جاتے ہیں۔

علی گڑھ میں داخلے کے وقت ہماری سادگی اور پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز میں نے اپنے ایک روم پارٹنر کے تیل نما شیمپو کو تیل سمجھ کر سر پر لگا لیا جس کی جھاگ ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس پر میرے ساتھی بہت ہی ہنسے اور مجھے سمجھایا کہ یہ سر دھونے کا صابن ہے۔ تیل نہیں۔ اسی طرح میرے ایک کشمیری دوست نے اپنے کمرے میں مٹی لا کر رکھی تھی جس کو وہ واش روم میں استنجا سے پہلے استعمال کرتا تھا جس سے ہر دو دن بعد فلش بند ہو جاتے تھے۔ جب اس کا پتہ چلا کہ فلاں (جو آج کل کشمیر میں نام ور وکیل اور ایک سیاسی جماعت کے سرکردہ رکن ہیں) کے مٹی استعمال کرنے سے ایسا ہوتا ہے تو اس کی سرزنش کی گئی اور آئندہ کے لیے کمرے کے سینئر کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ یونیورسٹی میں نئے آنے والوں کو اس کے آداب سکھائے جائیں۔

ہمارا ایک سکھ کلاس فیلو جو جالندھر سے تعلق رکھتا تھا، باقی سکھوں کے برعکس ہمارے Mess میں کھانا کھاتا تھا اور بڑا گوشت بھی بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ جب ہم اس کو اس پر چھیڑتے تھے تو اس کا جواب ہوتا تھا مذہب گھر میں ہوتا ہے گھر سے باہر نہیں۔ ہم لوگ بٹالہ سے تعلق رکھنے والے ایک ہندو دوست برج موہن جوشی کے ساتھ علی گڑھ سے واپسی پر دو دن کے لیے اس کے گھر گئے۔ اس نے ہمیں منع کر رکھا تھا کہ اس کے گھر پر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ظاہر ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا لیکن جب چھٹیوں کے بعد ہم لوگ یونیورسٹی واپس گئے تو جوشی نے بتایا کہ اس کی ماں کو ہمارے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا تھا جس پر اُس نے وہ چارپائی اور بستر جلا دیا اور برتن پھینک دیئے جو ہم نے استعمال کیے تھے۔ یہ دیہات میں تعصب کا عالم تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہم لوگ کشمیری ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں اور وہ ہمارے گھروں میں بے تکلف رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔

میں نے 1964 سے 1972 تک کوئی اتوار ایسا نہیں گزارا جس میں فلم نہ دیکھی ہو بلکہ اکثر فلمیں بارہا دیکھیں۔ فلم شہید کا ایک گانا ''جوگی ہم تو لٹ گئے تیرے پیار میں جانے تجھ کو خبر کب ہوگی'' سننے کے لیے میں نے یہ فلم دو بار دیکھی میرے ایک سکھ دوست نے یہ فلم 20 بار دیکھی۔ میں نے اس سے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا، ''یارہ کڑی اہہ گانڑاں سرسٹ کے گاندی ہے، میں اسی وجہ کر کے دکھدان کدے تاسر چاسی۔'' میں نے اس کو کہا تو واقعی سکھ ہے۔ اس نے جواب دیا ''مُسلہ تہہ نی ہوسکتاناں۔''

علی گڑھ سے فراغت کا ڈنر

جولائی 1970 میں یونیورسٹی سے فارغ ہونے سے قبل لاء فیکلٹی کے سالانہ ڈنر میں ہم لوگوں کو باضابطہ الوداع کیا گیا۔ مجھے پروفیسر رتن لال ریکھی جو ہمیں ایڈمنسٹریٹو لاء پڑھاتے تھے، کی صرف ایک منٹ کی تقریر اب بھی یاد ہے جو میری زندگی کا حاصل ہے انہوں نے انگریزی میں کچھ اس طرح سے کہا:

Gentleman you are now leaving this institution to govern the country. At times you may be confronted with a situation where you have to say no, and if the situation so arises, you must have the courage to say no. But if you say yes, you must mean it at the cost of your life."

میں سمجھتا ہوں کہ ایڈمنسٹریشن کا حاصل ہی دو کلمات ہیں، ''ہاں یا نہیں''۔ دنیا بھی فی الواقع ''نفی واثبات'' کی مرکب ہے۔ ہمارا المیہ ہے کہ ہم لوگ ہاں کہہ کر بے ایمانی کرتے ہیں اور نہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اگر یہ دو باتیں ایمان اور یقین کے ساتھ کر دی جائیں تو دنیا کے 95 فیصد جھگڑے اور فساد خود بخود ہی ختم ہو جائیں۔ میری زندگی میں سرکاری ذمہ داریوں کے دوران کئی ایسے موقع آئے جہاں میں نے اسی نصیحت پر عمل کر کے تکلیفیں اٹھانے کے باوجود بڑی کامیابی اور نیک نامی حاصل کی جن کا تذکرہ مناسب مقام پر کیا گیا ہے۔

علی گڑھ۔۔۔ایک سنہری دَور

علی گڑھ کا زمانہ یقیناً میری زندگی کا سنہری دور تھا۔ میں نہ صرف قابل اساتذہ سے مستفید ہوا بلکہ عملی زندگی میں کامیاب قدم رکھنے کے بہت سے اصول بھی سیکھے۔ جب میں علی گڑھ میں آیا تو ایک سیدھا سادہ سا دیہاتی کشمیری تھا جسے شہری زندگی کے رہن سہن کے بارے میں بہت کم علم تھا۔ لیکن جب وہ دو سال بعد یہاں سے رخصت ہوا تو میرے ہاتھ میں قانون کی ڈگری کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ تھا، علم سے محبت، اعتماد، اخلاقیات اور سنہرے اصول۔

اچھا تعلیمی ادارہ وہی ہے جو اپنے طالب علموں کو صرف ڈگری نہ دے بلکہ ان میں اہلیت، قابلیت اور اعتماد پیدا کرے۔ ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ان کو نکھار دے۔ علی گڑھ ایک ایسا ہی بہترین ادارہ تھا۔ اگرچہ 46 برس کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ایسے لگتا ہے کہ میں ابھی بھی ہاسٹل کے کمرے میں، کلاس میں، کاریڈور میں اور باغیچوں میں گھوم رہا ہوں۔

تھا اہتمام شیشہ و بادہ سے مطمئن
ہر ایک بادہ خوار ابھی کل کی بات ہے
تو دل سے آشنا تھی نہ دل تجھ سے آشنا
اے فکر روزگار ابھی کل کی بات ہے
وہ دوست بھی وقت کی صورت بدل گئے
تھا جن پر اعتبار ابھی کل کی بات ہے
روزِ ازل تو کہتا ہے مدت گزر گئی
روزِ ازل تو یار ابھی کل کی بات ہے
اخلاق کس نے تیرے ہوش کھو دیئے
تو بھی تھا ہوشیار ابھی کل کی بات ہے

اخلاق احمد اخلاقؔ